اُردو زبان

اور

فنِ داستان گوئی

کلیم الدین احمد

فہرست

بس ایک بات	۵
داستان کیا ہے؟	۷
داستان کی ٹکنیک	۱۸
طلسم ہوش ربا	۳۳
" "	۴۸
" "	۶۱
" "	۷۳
" "	۸۴
" "	۹۱
بوستانِ خیال	۱۰۳
" "	۱۲۰
مختصر داستانیں	۱۳۹
" "	۱۶۰
منظوم داستانیں	[illegible]
خاتمہ	۱۹۶

(۹)

"بوستان خیال" کی شان نزول یہ ہے: "میر تقی خیال متوطن گجرات گردش گردون دوں سے پریشان خاطر ہو کے عہد سلطنت میں محمد شاہ بادشاہ کے شہر دہلی میں وارد ہوئے۔ انکی منظور نظر ایک زن مطربہ تھی۔ شب کو اکثر وہ ان سے قصص تازہ کی فرمائش کیا کرتی تھی۔ یہ بپاس خاطر اپنی محبوبہ کے، روز ایک قصہ تازہ اپنی طبیعت سے ایجاد کر کے سنا دیتے۔ ان کے مکان کے عقب میں کچھ لوگ جمع ہوتے تھے اور داستان امیر حمزہ کی بیان کی جاتی تھی۔ میر تقی بھی کبھی کبھی تفریحاً شریک جلسہ ہوتے تھے۔ ایک روز بعد ختم داستان گو نے میر تقی کو سنا کے کہا کہ جی ہاں داستان کے مرتب کرنے کے واسطے خداوند عالم قابلیت پیدا کرے تو ممکن ہے ورنہ تحصیل علوم و فنون سے اگر کوئی شخص داستان مرتب کرنا چاہے تو محال ہے۔ یہ بات میر تقی کو ناگوار معلوم ہوئی۔ کہا کیا کہتے ہو صاحبان علم و فضل کے روبرو ایسے خیالات کی کیا حقیقت ہے... تھوڑے ہی عرصہ میں چند اجزا کتاب کے مرتب کر کے

اس جلسہ میں گئے اور بعد ختم داستان امیر حمزہ اہالیان جلسہ کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ چند اجزا ایک قصہ تازہ کے دستیاب ہوئے ہیں اجازت ہو تو سناؤں سب نے متفق اللفظ کہا بسم اللہ ضرور پڑھیے۔ جب پڑھا تمام حاضرین جلسہ محو ہو گئے اور ہر طرف سے صدائے تحسین بلند تھی اور آپس میں کہتے تھے واقعی اس طرح کا قصہ آج تک نہیں سننے میں آیا۔ یہ قصہ مصنوعی نہیں معلوم ہوتا بلکہ واقعہ اصلی ہے

یعنی یہ داستان محض ایک اتفاقی واقعہ کا نتیجہ ہے۔ اگر وہ نامعلوم داستان گو میر تقی کو سنا کر یہ نہ کہتا "جی ہاں داستان کے مرتب کرنے کے واسطے خداوند عالم قابلیت پیدا کرے تو ممکن ہے ورنہ تحصیل علوم و فنون سے اگر کوئی شخص داستان مرتب کرنا چاہے تو محال ہے تو شاید یہ داستان عالم وجود میں نہ آتی یہ بھی ظاہر ہے کہ "بوستان خیال" داستان امیر حمزہ کا جواب ہے اور اس میں قصداً ایک بہتر داستان لکھنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اسکا خلاصہ غالب کے الفاظ میں یہ ہے: "معز الدین فیروز بخت کی کشور کشائیاں، ابوالحسن جوہر کی نیرنگ نمائیاں، عجائبات حکیم قسطاس کی حیرت فزائیاں، ملکۂ نوبہار کی رنگین ادائیاں، جمشید خود پرست کی زور آزمائیاں ضار منکوس منحوس کی بیحیائیاں، مسلمین و کفار کی لڑائیاں مسلمانوں کی بھلائیاں کافروں کی برائیاں"۔ یعنی یہاں بھی وہی چیزیں ہیں جو "داستان امیر حمزہ" میں ملتی ہیں لیکن بھیس کچھ مختلف ہے "بوستان خیال" میں بھی باغ کی صفت، معشوقوں کا سراپا، صبح و شام کا ہونا، عجائبات طلسم کی نیرنگیاں، کوہ و صحرا، بحر و بر کی کیفیت رزم بزم کی لطافت" غرض انھیں چیزوں سے ہم دوچار ہوتے ہیں جو "طلسم ہوش ربا" میں ہماری دلچسپی کا سامان ہیں۔

کہتے ہیں کہ نقش ثانی نقش اول سے اچھا ہوتا ہے۔ "بوستان خیال" نقش ثانی کا مرتبہ رکھتی ہے۔ لیکن یہہ نقش اول یعنی "داستان امیر حمزہ" خصوصاً "طلسم ہوشربا" کے مرتبہ کو نہیں پہنچتی۔ شاید مادی اور دنیا میں یہہ مقولہ صحیح ثابت ہو لیکن دنیائے ادب میں تو یہہ نادرست ہے۔ ورنہ آج "ایلیڈ" اور "ڈوائن کومیڈی" جیسی کتنی کتابیں موجود ہوتیں بلکہ ان سے بہتر۔ لیکن واقعہ کچھ اور ہے۔ بہرکیف "بوستان خیال" میں اتنا ضرور ہے کہ "طلسم ہوشربا" کے بعض نقائص سے ہمیں سابقہ نہیں پڑتا۔ وہ تکلف وہ مبالغہ وہ مضامین کی پریشان کن تکرار، وہ الفاظ ونقوش کا ناموزوں سیلاب یہاں نہیں، نسبتاً یہاں اعتدال، انتخاب، اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ اس لئے پہلی نظر میں داستان زیادہ خوشگوار معلوم ہوتی ہے۔ دو خصوصیتیں اسے "طلسم ہوشربا" سے ممیز کرتی ہیں اور ان دونوں خصوصیتوں کا قصداً التزام کیا گیا ہے۔

پہلی مرتبہ جب یہ داستان سنائی گئی تھی تو "اہالیان جلسہ" نے "صدائے تحسین" بلند کی تھی، اور وہ آپس میں کہتے تھے "یہہ قصہ مصنوعی نہیں معلوم ہوتا بلکہ یہہ کوئی واقعہ اصلی ہے"۔ یہی اس کی پہلی خصوصیت ہے۔ قصد یہ ہے کہ "تمہید و بیان قصہ میں تاریخ گزشتہ کا لطف آئے"۔ یہہ نہ معلوم ہو کہ داستان گو افیون کی ترنگ میں آسمان زمین کے قلابے ملا رہا ہے۔ بلکہ داستان میں تاریخی واقعیت اور صحت نظر آئے۔ وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے یہہ قصد بڑا تعریف کی بات ہے اس سے داستان گوئی کے ایک بڑے گر سے واقفیت ظاہر ہوتی ہے۔ عموماً داستانوں میں خام مواد ناقابل یقین اور مافوق فطرت ہوتا ہے، جسے اس فن کے صحیح

اصول سے واقفیت ہوتی ہے وہ جانتا ہے کہ ناقابل یقین چیزیں بدیہی ہوجائیں، اور فوق فطرت اشیا، فطری نظر آئیں۔ وہ ایک ایسی فضا پیدا کرتا ہے کہ ساری چیزیں بالکل معمولی اور جانی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ "بوستان خیال" میں اس اصول کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور خصوصاً تمہید میں کوئی ایسی بات نہیں ملتی جسے ہم ناممکن یا مستبعد سمجھیں، طوالت کا خوف ہے ورنہ مفصل مثالیں پیش کی جاتیں۔ پھر بھی ابتدا کا ایک مختصر ٹکڑا ملاحظہ ہو:۔

"راویان اخبار پیشیں و ناقلان آثار سقردین بہ یقین صفحۂ تاریخ پر اس طرح تحریر کرتے ہیں کہ نسب صاحبقران واجب التعظیم شاہزادہ معزالدین ابوتمیم کا بعد دس پشتوں کے سید الصادقین حضرت ابوعبداللہ جعفر بن محمد صادق علیہ السلام سے ملتا ہے اور صاحب مرأت الجنان حمداللہ مستوفی نے ذکر ان کے نسب شریف کا کتاب عیون التاریخ میں اس طرح نقل کیا ہے کہ مہدی صاحبقران کے جد کلاں تھے۔ وہی اس قبیلے سے پہلے تخت نشین ہوئے اور مہدی کہ محمد نام تھا پسر عبداللہ تھے اور لقب ان کا راضی اور وہ بیٹے قاسم کے تھے کہ متقی لقب تھا اور قاسم بیٹے احمد کے ملقب بہ وفی اور احمد بیٹے محمد کے کہ لقب ان کا وصی تھا اور وہ بیٹے اسمٰعیل بن امام جعفر صادق علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیکن پسر عبداللہ یعنی محمد کہ مہدی لقب تھا اور احمد نام اور قائم بھی لقب تھا وہ پدر کلاں صاحبقران گیتی ستاں یعنی معزالدین کے جد تھے۔۔۔ جب یہ سررشتہ از روئے تاریخ معلوم ہوا اب جاننا چاہئے کہ۔۔ جب محمد بن اسمٰعیل کو ابوجعفر منصور دوانقی نے۔۔ گرفتار کرکے ایک عمارت بغداد میں چن دیا۔۔ احمد اپنے پسر کو وصی کیا اور سید احمد وفی خوف سے خلفائے عباسیہ کے ساتھ آدمیوں کے

ساٹھ کہ جو سادات بنی فاطمہ تھے زمین طوس کی طرف بھاگے۔ اور یہ ساٹھ نفوس سادات پہاڑوں اور غاروں میں عسرت سے بسر اوقات کرتے تھے۔ جب ہارون رشید کہ خلیفہ پنجم عباسیوں کا تھا اس نے قتل سادات پر کمر باندھی اور تجسس احوال ان سادات بنی فاطمہ کا ہوا ناگاہ ان ساٹھ نفوس کی اسکو خبر پہنچی۔ فوراً قحطبہ حاکم طوس کو نامہ لکھا کہ جس طرح ہوسکے ان سادات کو زندہ گرفتار کر بعد ازاں ایک عمارت شہر میں بنوا اور اس میں تین حجرے تیار کرا دے اور درمیان میں ایک چاہ عمیق بنوا کے ان سادات کو اس میں قید کر اور منتظر رہ تاکہ میں وہاں آؤں۔ قحطبہ نے جاسوسوں کو ان سادات کی تلاش کے لئے مقرر کیا چنانچہ انکی خبر دریافت کر کے نصف رات کو فوج بھیجی۔ اثنائے خواب میں انکو گرفتار کر کے جس طرح ہارون رشید نے اس ملعون کو لکھا تھا تین حجروں میں ان ساٹھ نفوس اولاد فاطمہ کو قید کیا اور ہارون رشید کو لکھا کہ امیدوار انعامات کا ہوں۔۔۔

دیکھا! نفس واقعہ میں کوئی ایسی بات نہیں جسے ہم ناممکن کہہ سکیں یعنی کوئی چیز ایسی نہیں ——— جو قوانین فطرت کے خلاف یا فوق العادت ہو تاریخی اشخاص کا ذکر بھی واقعہ کی صحت کی ایک دلیل ہے۔ یہی واقعیت طرز بیان کی بھی نمایاں خصوصیت ہے۔ قصہ اس طرح کہا جاتا ہے کہ گویا کسی اصلی واقعے کا ذکر ہے۔ کہنے والے نے ایسا لب و لہجہ اختیار کیا ہے کہ جیسے اس دماغ میں کسی غیر معمولی، تخیلی، حیرت انگیز داستان کا خیال بھی نہیں گزرا ہے لیکن اس طرز بیان کا پوری داستان میں نباہ نہ ہوسکا جیسے جیسے داستان آگے بڑھتی ہے اور غیر معمولی واقعات عجیب و غریب شعبدے سامنے آنے لگتے ہیں، لب و لہجہ "طلسم ہوشربا" سے قریب تر ہوتا جاتا ہے اور زیادہ باثر واقعات و مناظر میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا

لیکن اس مقصد کا ایک اثر ہر جگہ البتہ ملتا ہے اور وہ مبالغے اور زیادتی کی کمی ہے اس لیے داستان میں سادگی زیادہ، فطری حسن زیادہ ہے لیکن ایک نمایاں کمی بھی ہے، "طلسم ہوش ربا" ایک بحرِ ذخار ہے۔ اسکی سطح پر خس و خاشاک شکستہ جہاز، بھدے اور بدنما، اجڑے ہوئے درخت، مردہ جانور نظر آتے ہیں۔ ساتھ ساتھ حسین بدلنے والے مناظر بھی ملتے ہیں۔ کہیں کشادہ سبزہ زار ہے تو کہیں سر بفلک پہاڑ، کبھی صبح صادق کا سماں ہے تو کبھی شفق کی رنگینی اور کبھی تاروں بھری رات "بوستان خیال" ایک کشادہ دریا ہے، خس و خاشاک سے پاک، حسین لیکن ذرا اگھر یلو قسم کا۔ یہاں وہ خود رفتگی، وہ بیباکی تخیل غرض وہ لطیف زیادتی نہیں جو ہمیں "طلسم ہوشربا" میں متعجب و مسرور کرتی ہے اور جو اس کی بڑائی کی ذمہ دار ہے۔

دوسری خصوصیت جو "بوستان خیال" کو ممیز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ اس میں مصنف کی قوت دماغی اور اکتساب علم و فضل حرف حرف سے پیدا ہے "میر تقی سے اس داستان گو نے کہا تھا کہ "تحصیل علوم و فنون سے اگر کوئی شخص داستان مرتب کرنا چاہے تو محال ہے" اور یہ بات میر تقی کو ناگوار گزری تھی۔ انکے خیال میں صاحبان علم و فضل کے روبرو ایسے "خرخرفات" کی کچھ حقیقت نہ تھی۔ انھوں نے ان خرخرفات کے ساتھ قصداً اپنے علم و فضل کی بھی نمائش کی ہے۔ "بوستان خیال" میں ہر جگہ علمیت نمایاں ہے اور پڑھنے والے اس "علمیت" سے مرعوب ہوتے ہیں۔ کم سے کم یہ تو ضرور سمجھتے ہیں کہ معمولی استعداد رکھنے والا ایسی داستان مرتب نہیں کر سکتا۔ "طلسم ہوش ربا" میں یہ علمیت نہیں۔ اس میں بہت سی خامیاں اور غلطیاں ایسی ملتی ہیں جن کی وجہ "علم و فضل" کی کمی ہے۔ "بوستان خیال" میں اس قسم کی خامیاں اور غلطیاں

نہیں ملتیں۔ گنجائش نہیں ورنہ میں وسعت خیالی اور علمی قابلیت کی چند مثالیں پیش کرتا۔ وہ حصہ ملاحظہ ہو جس میں نادرہ راز دار طلسم کی حقیقت شاہزادہ معز الدین سے بیان کرتی ہے۔ لیکن محض وسعت معلومات کی نمائش داستان میں خوشگوار اثر نہیں پیدا کر سکتی۔ ملاحظہ ہو:۔ "زحل سیاہ مطلق اور نحس اکبر ہے۔ ہندی میں سنیچر کہتے ہیں اور اس کے منسوبات سے دیہات و صحرا و مشائخ و خونی و قزاق و بدکار ہوتے ہیں اور تمام پھل درختوں کے بدمزہ و تلخ پیدا ہوتے ہیں اور مشتری کو جس کو ہندی میں برہسپت کہتے ہیں یہ سعد اکبر ہے اور رنگ اس کا صندلی یا دامی و جوزی و نخودی قرار دیا گیا ہے اور منسوبات اس کے زاہد و عابد و سادات و علماء فضلا ہیں اور پھل درختوں کے شیریں اور بامزا ہیں اور مریخ جسے ہندی میں منگل کہتے ہیں سرخ رنگ سیاہی مائل جلاد فلک ہے۔ منسوبات میں اس کے سیاہ پیشہ اور مردمان سنگدل ہیں اور میوہ ہائے ترش و تلخ ہیں۔۔۔"

اس قسم کی علمی نمائش سے داستان کے حسن میں کمی ہوتی ہے اور اس کی دلچسپی بے لطفی سے بدل جاتی ہے۔ "بوستان خیال" میں قصداً اور ضرورت سے زیادہ اس قسم کی نمائش کی گئی ہے اور اس وجہ سے "طلسم ہوش ربا" سے قدر و قیمت میں زیادہ نہیں کم ہو جاتی ہے۔ اس نمائش کے ساتھ ساتھ یہاں معنی خیزی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "داستان امیر حمزہ" کو خرافات، لغو و بے معنی سمجھ کر علم و فضل کے زور سے اس میں بلند و گہرے معانی داخل کیے گئے ہیں۔ عجائبات طلسم، واقعات و اشخاص قصہ، لوگوں اور چیزوں کے نام بھی اندرونی معنی رکھتے ہیں اور ان معانی کا بیان بھی ایک طویل داستان ہے۔ یہاں ایک مختصر سی مثال پیش کی جاتی ہے۔

شاہزادہ معزالدین "اغوائے امارہ خاتون" سے ایک مقام پر ایسا خود رفتہ ہو جاتا ہے کہ "اپنے آغاز و انجام کا کچھ خیال نہ کر کے ملکہ صبح دلکشا سے خلعت ملت" ہو جاتا ہے اور یہ امر ملکہ نوبہار گلشن افروز کی خفگی کا باعث ہوتا ہے۔ نادرہ راز دار اس واقعہ کی یوں توجیہہ کرتی ہے: "یہ امر غور طلب ہے کہ جہاں طاقی شاہ در اسباب سلاطین ہوں، دسر دار روح الملک ان رئیسوں کا بادشاہ ہو پھر نام امارہ حکمت سے کیوں خالی ہوگا کہ طاقی در اسباب خلط سوداد صغرا کی صفت ہو تو لفظ امارہ بھی بجائے نفس امارہ سمجھنا چاہئے اور اس کے حکم سے احتراز واجب ہے۔"

اس قسم کے معانی ہر جگہ ملتے ہیں اور یہ معانی قصداً داستان میں ہر جگہ بر دئے گئے ہیں۔ اور یہ معنی خیزی بھی علم و فضل کے نمائش کی ایک صورت ہے یہاں وہ معنی خیزی نہیں جو "داستان امیر حمزہ" میں فطری طور پر پیدا ہوتی ہے اور قصے کی ترقی کے ساتھ ترقی پاتی ہے۔ "بوستان خیال" میں ضرورت سے زیادہ قصد، کاوش، علمیت کی کارفرمائی ہے۔ نتیجہ گرانی، اشکالی اور بے لطفی کی صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے۔

"واقفیت" اور "علمیت" سے قطع نظر، ہر جگہ "بوستان خیال" میں داستان امیر حمزہ" کا فیض نظر آتا ہے اور ایسا ہونا ناگزیر تھا۔ اس تخیل کی بزرگ پیداوار کے بعد اسی رنگ میں لکھنا اور اس سے بالکل الگ رہنا ناممکن تھا جہاں علیحدہ رہنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں زیادہ تر نتائج خوش گوار نہیں ہوتے۔ البتہ جب اسی کے نقش قدم پر چلا جاتا ہے تو پھر کامیابی ہوتی ہے۔ "اگر داستان امیر حمزہ" نہ ہوتی تو شاید "بوستان خیال" کی ہمارے دلوں میں زیادہ عظمت ہوتی لیکن اس

آفتاب کے آگے اس چاند کی روشنی ماند پڑ جاتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس آفتاب کے بغیر اس چاند کا تصور بھی ممکن نہیں،

میں نے ابھی کہا ہے کہ "بوستان خیال" میں ہر جگہ "داستان امیر حمزہ" فیض نظر آتا ہے۔ اشخاص، واقعات، بیانات غرض ہر جگہ اسی آفتاب کا پرتو ہے۔ ایک امیر حمزہ کے فیض سے یہاں کئی صاحبقران پیدا ہو گئے ہیں لیکن ایک بھی امیر حمزہ سے ہمسری کا دعویٰ نہیں رکھ سکتا۔ صاحبقران اکبر شاہزادہ معز الدین ابو تمیم طلسم اور بیرون طلسم میں قسمت آزمائی اور زور آزمائی کرتے ہیں سرمہ زحل، مراۃ الغیب ذرع صد مثقال، پنجہ دیوکش، یہ نادر چیزیں حاصل کرتے اور صاحبقران اکبر کا لقب پاتے ہیں، یہ بھی جوانمرد، دیوکش، فاتح طلسم ہیں، یہ بھی انسانی اور اخلاقی محاسن سے آراستہ ہیں۔ لیکن امیر حمزہ میں جو بات ہے وہ شاہزادہ معز الدین میں موجود نہیں نقل پھر نقل ہے اصل کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتی۔ صاحبقران اعظم خورشید تاج بخش، صاحبقران اصغر شاہزادہ بدر منیر، شاہزادہ اکلیل الملک صاحبقران جزائر کسی میں وہ بزرگی وہ شوکت و حشمت وہ انسانیت، وہ "صاحبقرانی" نہیں جو امیر حمزہ کی شخصیت میں نمایاں ہے، یہ ضرور ہے کہ یہ صورتیں "بعد میں بنائی گئی ہیں اس لئے ان میں اکثر بظاہر زیادہ شوکت و حشمت معلوم ہوتی ہے اور انکے ساتھ جو لوازمات ہیں وہ بھی بعض وقت زیادہ پر اثر نظر آتے ہیں۔ لیکن جو اصلیت امیر حمزہ کی شخصیت میں ہے وہ اور کسی میں نہیں ملتی۔

جس طرح امیر حمزہ کے ساتھ خواجہ عمرو ہیں اسی طرح شاہزادہ معز الدین کے

بھی ایک رفیق و جاں نثار ہیں۔ سلطان ابوالحسن جوہر خواجہ عمرو کی طرح جوہر بھی "فن عیاری میں طاق بلکہ شہرۂ آفاق ہیں انکی" تعریف" ایک عورت کی زبان سے سنیئے۔ بس یہی معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ عمرو کا ذکر ہے۔" شاید تم نہیں جانتی ہو یہ میاں نوشاہ بڑے پاک ذات ہیں، شیطان بھی ان سے دور دور بھاگتا ہے۔ صاحبقران اکبر کے عیار ہیں۔ کبھی عورت بنتے ہیں۔ کبھی لونڈی بنتے ہیں کبھی ناچتے ہیں، کبھی گاتے ہیں۔ جہاں شیطان کا بھی گزر نہ ہو یہ وہاں جاتے ہیں ہزاروں مکر، فریب، جعل، دغابازیاں انکو یاد ہیں۔ بڑے بڑے دانایان جہاں کو یہ جناب دام فریب میں گرفتار کر لیتے ہیں۔ انکے پاس ایک زنبیل ہے قارون کی دولت سے بھی سوا اس میں روپیہ وغیرہ ہے۔ ہزارہا آدمی اس میں قید ہیں۔ شہر آباد ہیں دریا جاری ہیں۔ ان سے خدا اپنی پناہ میں رکھے خدا نہ کرے کہ یہ کسی کے دشمن ہو جائیں پھر اس کی جان کا بچنا محال ہے"۔ مزید لکھنے کی ضرورت نہیں۔ ابوالحسن جوہر میں عمرو عیار کا ناقص چربہ اتارا گیا ہے دوسرے عیاروں اور انکی عیاریوں میں بھی خواجہ عمرو کا فیضان ہے میں دو مثالوں پر اکتفا کرتا ہوں۔ خواجہ عمرو نہایت لالچی تھے اور "داستان امیر حمزہ" انکی اس کمزوری کی مثالوں سے بھری پڑی ہے "مہتر مہتران روزگار" مہتر توفیق کی باتیں سنئے خواجہ عمرو کی آواز سے کسی قدر مشابہ ہے: "صاحبقران نے فرمایا یہ فتح تن تنہا مہتر عالی قدر نے کی ہے۔ مہتر بولا، انصاف صاحبقران کے قربان اس صورت میں امیدوار ہوں کہ ایک کوڑی سے لگا کے اشرفی جواہر تک جتنا مال ہے، سب غلام کو مرحمت ہو کسی کو اس میں سے پھوٹی کوڑی نہ ملے اس لئے کہ آج کل غلام بہت مفلس ہو رہا ہے

قرض بھی زیادہ ہو گیا ہے۔ قرضخواہ سخت حیران کرتے ہیں"۔ نقالی کی زیادہ روشن یہہ دوسری مثال ہے۔ زمرد شاہ باختری کی داڑھی کے ہر بال میں موتی پرو دئے ہوئے تھے۔ خواجہ عمرو بھلا کب چوکتے ہیں۔ عیاری کر گزرے اور زمرد شاہ کی داڑھی مونڈ کر موتیوں کو اپنے تصرف میں لے آئے"۔ "بوستان خیال" میں جمشید خود پرست نے جو خداوند نقالی بگڑی ہوئی صورت ہے "زمرد شاہ کا قصہ سنکر اسکی نقل کی یعنی اپنی داڑھی موچھوں کے بال میں موتی پرو دئے"۔ ہنگ مصری نے جو خواجہ عمرو کی عیاری سے واقف تھا جمشید خود پرست کی وہی درگت بنائی جو خواجہ عمرو نے زمرد شاہ کی بنائی تھی اور ایک رقعہ لکھ کے مونچھ میں لٹکا دیا۔ مضمون یہہ تھا: "اے جمشید ہم نے کہا تھا کہ ابو حاکم نے نقل زمرد شاہ کی کی تھی یعنی اس احمق نے اپنی ریش نجس میں موتی لگائے تھے لیکن یہہ نہ کہا کہ عیار عمرو نام نے اس کی داڑھی بطمع مروارید خوب مونڈی اور مروارید لے گیا۔ تو نے جو اس مردک کی نقل کی اور داڑھی میں موتی پرو دئے ہم بھی عمرو عیار کی شکل بن کے داڑھی مونڈ لے گئے۔ اس واسطے کہ بدون اس کے نقل پوری نہ ہوتی ناقص رہتی اب وہ نقل پوری ہو گئی"۔ یہاں "داستان امیر حمزہ" کی کھلی نقالی ہے اور اس نقالی کا اعتراف بھی ہے۔ نقالی تو ہر جگہ ہے لیکن اعتراف ہر جگہ نہیں۔

جمشید خود پرست اور ضارہ عنکوس کی صورتوں میں نقاد اور اس کا شیطان بختیارک نمودار ہوئے ہیں۔ جمشید خود پرست تنا زجادو کی مدد سے خدائی کرتا ہے۔ یہہ "زنگی بچہ" اس طرح اپنی خداوندی کا ثبوت پیش کرتا ہے۔ "خداوند ہر شے واقعی طبیعت مجردہ ہے۔ اس نے مجھے اپنا نائب کیا ہے اور خطاب ملا ہے۔

اور حکم دیا ہے کہ لوگوں کو سجدوں پر راغب کرد اس کی پیشانی میں ایک داغ تھا جس کے دیکھنے سے سب سجدہ کرتے تھے" یہ علامت بھی "طبیعت مجردہ" نے بخشی تھی۔ لقا کی طرح جمشید احمق بھی ہے اور مضحک بھی لیکن ادبی نقطۂ نظر سے اس کی شخصیت زیادہ کامیاب نہیں۔ ضنار منکوس، جمشید کا استاد قرساق" ذرا بختیارک سے مختلف ہے۔ اسے سحر و ساحری میں دخل ہے اور بختیارک کو جادو سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ لیکن یہ فرق اہم نہیں۔ بختیارک اور ضنار منکوس دونوں ظریفانہ رنگ میں رنگے ہوئے ہیں لیکن بختیارک کی شخصیت زیادہ کامیاب ہے۔ عموماً اسے ہم خواجہ عمر کی روشنی طبع کا تختۂ مشق سمجھتے ہیں۔ خواجہ عمر اسے دھولیں لگاتے ہیں اور پھر اس سے زر و مال وصول کرتے ہیں۔ ہم بختیارک کی ہزیمتوں پر ہنستے ہیں لیکن یہ بھی سمجھتے ہیں کہ وہ ایک بدی کی طاقت ہے اور اسے جہاں موقع ملتا ہے وہ مسلمانوں کو زک دیتا ہے۔ فطرتاً وہ نہایت چالاک ہے۔ یہ اسکی بدقسمتی ہے کہ لقا اور اس کے مددگار بختیارک کی رائے پر نہیں چلتے ورنہ وہ لشکر اسلام کو سخت نقصان پہنچاتا۔ اس کی طبیعت میں غضب کا ابھار ہے۔ کتنی شکستوں کے بعد بھی وہ نہیں ہارتا۔ لقا کی خداوندی اسی کے دم سے قائم رہتی ہے۔ اس کے سارے اخلاقی نقائص کے باوجود بھی ہم اس کی تعریف کرتے ہیں۔ اس میں ظرافت کا مادہ بھی ہے اور ظرافت اس کے بہت سے عیوب پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ غرض بختیارک نہایت اہم اور دلچسپ کردار ہے ضنار منکوس اس کی گرد کو نہیں پہنچتا۔ ضنار منکوس کی ذہانت، حکمت عملی، ساحری کوئی چیز اعلیٰ درجہ کی نہیں۔ یہ ضنار جادو ہے جو جمشید کی خداوندی کا سبب ہے۔

خمار جادو کا ذکر "بوستانِ خیال" کے ایک دوسرے عنصر کی طرف توجہ کو رجوع کرتا ہے اور وہ جادو ہے اس داستان میں بھی جادوگر، طلسم، طلسمی اشیا، طلسمی شعبدوں کا ذکر ہے لیکن جہاں تک جادو کا تعلق ہے "بوستانِ خیال" داستان امیر حمزہ" سے بہت پیچھے ہے ممکن ہے کہ موجودہ زمانہ میں اس کمتری کو بوستان خیال کی برتری کا سبب سمجھا جائے کیونکہ یہاں جادو کو زیادہ طمطراق کے ساتھ نہیں پیش کیا گیا ہے لیکن ایسا سمجھنا غلط ہوگا یہاں بھی طلسمی کارخانہ ہر جگہ پھیلا ہوا ہے۔ جسکے حدود کائنات کے حدود کی طرح وسیع ہیں۔ شاہزادہ عزالدین کو بھی طلسمی شعبدوں سے سابقہ ہوتا ہے وہ ان مرحلوں کو فتح کرتے ہیں اور شعبدوں سے نجات حاصل کرتے ہیں۔ یہاں بھی جادو کے کرشمے ہیں، جن، دیو، پری، شیطان سبھی کچھ ہیں لیکن ان میں وہ آب و تاب نہیں جس سے ہم داستان امیر حمزہ میں دوچار ہوتے ہیں۔ خصوصًا جادو کا حصہ نسبتًا بہت کمزور رہ گیا ہے غالبًا اسکی وجہ یہ ہے کہ میر تقی اس قسم کی چیزوں کو محض خرافات سمجھتے تھے اور ان چیزوں میں وقت ضائع کرنا اپنے علم و فضل کی شان کے خلاف، لیکن داستان "امیر حمزہ" کا جواب اسی وقت ممکن تھا جب جادو اور جادوگروں کی بھی اسی پیمانے پر مرتب کی جاتی، حقیقت یہ ہے کہ اس موضوع پر "داستان امیر حمزہ" اور خصوصًا "طلسم ہوش ربا" میں انتہائی قوت ایجاد انتہائی زور تخیل سے کام لیا گیا ہے اس پر سبقت لے جانا ناممکن نہیں تو نہایت دشوار ضرور ہے۔ "بوستان خیال" میں جادوگروں کی شخصیت کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ہے۔ کم جادوگر یادگار شخصیت کے حامل ہیں اور جو ہیں انکی شخصیت بھی زیادہ بااثر نہیں۔ یہاں نہ افراسیاب ہے۔ نہ شہنشاہ لاچین، نور افشاں، ہوشمند، کنار رسیدہ، نور افشاں، کوکب روشن ضمیر، برہمن روئیں تن، آفات چہار دست،

باہیان زرد پوش، تاریک شکل کش، ملکہ مشتری ماہ طلعت، حیرت، مہرخ بزاران، مجلس، بہار غرض کیسی کیسی رنگین متنوع اور یادگار شخصیتیں "طلسم ہوشربا" میں ملتی ہیں۔ جن سے دلچسپی میں اضافہ ہوتا ہے۔ اس پایہ کی شخصیتیں "بوستان خیال" میں موجود نہیں، یہاں جادو کے بدلے "حکمت" کی نمایش ہے اور یہ بھی کوئی نئی چیز نہیں۔ "داستان امیر حمزہ" سے یہ چیز بھی اخذ کی گئی ہے۔ (حکیم قسطاس الحکمت کا نام بھی "طلسم ہوش ربا" سے ماخوذ ہے) لیکن اسکی نمائش بہت وسیع پیمانہ پر ہے اور "حکمت" نے جادو سے زیادہ اہمیت اختیار کر لی ہے۔

"داستان امیر حمزہ" میں بھی ایک "حکیم" ہیں۔ بزرجمہر، صاحب علم و فضل، علم نجوم و رمل اور دیگر علوم و فنون سے آگاہ۔ بزرجمہر نہایت ہوشمند ہیں۔ امیر حمزہ کے مشیر و مددگار ہیں اور امیر حمزہ کی حیرت انگیز روحانی اور دنیاوی ترقی کے نگہبان، فرشتۂ رحمت کی طرح۔ جہاں کوئی مشکل درپیش ہوئی تو امیر حمزہ فوراً بزرجمہر کی طرف رجوع کرتے ہیں، اور ان کے مشورہ پر عمل کرتے ہیں، پھر وہ مشکل آسان ہو جاتی ہے۔ "داستان امیر حمزہ" کے شروع میں بزرجمہر کی شخصیت برابر پس پردہ موجود رہتی ہے اور امیر حمزہ کی رہنمائی کرتی ہے۔ بغیر ان کی مدد کے امیر حمزہ بہت جلد اپنی ناتجربہ کاری کا شکار ہو جاتے اور قبل از وقت ان کی ترقیوں کا سلسلہ منقطع ہو جاتا۔ لیکن جیسے جیسے امیر حمزہ روحانی اور دنیاوی ترقی کے منازل طے کرتے ہیں جیسے جیسے انکی شخصیت بلند و بزرگ ہوتی اور انکی دنیاوی طاقت بڑھتی اور پھیلتی ہے، بزرجمہر کی اہمیت کم ہوتی جاتی ہے۔ ان کی وفات کے بعد ان کے فرزندوں سے مشورہ طلب کیا جاتا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ فرزندان بزرجمہر کا مختلف شخصیوں کی ترقی اور ہونے والے

واقعات پر کوئی خاص اثر نہیں پڑتا۔ وہ کبھی کبھی ضرور تاً، خصوصاً داستان گو کی آسانی کے لیے سامنے لائے جاتے ہیں لیکن ان کی کوئی خاص ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

بزرجمہر امیر حمزہ کے مشیر و مددگار، نگراں و نگہبان ہیں۔ "بوستان خیال" میں حکیم قسطاس الحکمت شاہزادہ معزالدین کے مشیر و مددگار و نگہبان ہیں۔ اگر حکیم قسطاس الحکمت نہ ہوتے تو شاید معزالدین صاحبقران کا درجہ حاصل نہ کرتے جہاں کوئی مشکل درپیش ہوئی تو شاہزادہ معزالدین فوراً حکیم قسطاس الحکمت کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ انکے مشورہ پر عمل کرتے ہیں پھر وہ مشکل آسان ہو جاتی ہے "بوستانِ خیال" میں شروع سے آخر تک حکیم قسطاس الحکمت کی شخصیت کا اثر ہر جگہ نظر آتا ہے وہ ہر جگہ شاہزادہ معزالدین کی رہنمائی اور مشکل کشائی کرتے ہیں بغیر انکی مدد کے شاہزادہ معزالدین کامیابی کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتے بوستانِ خیال میں حکیم صاحب کی شخصیت کو بہت بڑھایا گیا ہے نتیجہ یہ ہے کہ انکی شخصیت سے زیادہ اہمیت اختیار کرتی ہے اسکی وجہ سے معزالدین کی صاحبقرانی کا کچھ زیادہ گہرا اثر نہیں ہوتا۔

کہتے ہیں کہ "عمران شاہ کی دختر بیمار ہوئی، اطبائے شہر علاج سے ایسے عاجز ہوئے کہ سب نے جواب دیا بادشاہ نے ایک کشتی میں سب کو سوار کر کے مع انکی ذرّیت کے دریا برد کر دینے کا حکم دیا، وہ بیچارے زیادہ زاری کرنے لگے۔ اس عرصہ میں ایک جہاز آیا۔ اہلِ جہاز نے گریہ وزاری کی حال پوچھا۔ کہ ان نے حال بیان کیا۔ اسمیں ایک بزرگ تھا وہ بولا تمھارے بادشاہ کو کیا ہو گیا ہے۔ کوئی شخص آمادہ ہے کہ بدون حکم خدا مریض کو اچھا کرے یہ بیچارے کس طرح اچھا کر سکتے ہیں۔ تم جاؤ بادشاہ سے مریض کے جسم کا پہنا ہوا کپڑا لاؤ ہم مریض بتا دیں گے۔ اس کا علاج کرنا، اور حکیموں کو رہا کرو۔ ملاحوں نے

فوراً بادشاہ سے عرض کی۔ بادشاہ اس دختر کا ملبوس لے کر قریب جہاز آیا اور دست بستہ حال ملکہ عرض کیا۔۔۔ اس مرد بزرگ نے لباس مریضہ کو سونگھا اور فرمایا اس عورت کو تپ دق عارض ہے۔۔۔ اور ایک نسخہ لکھا اور کہا یہ دوا پلاؤ اور۔۔۔ حکیم نے کہا چہار شنبہ کو یہ غلام کشتی پر یہاں آوے گا۔ اسکو ملبوس ملکہ دینا ہیں حال بذریعہ اس پارچہ کے دریافت کرلوں گا۔ بادشاہ نے غلام سے حکیم صاحب کا نام پوچھا، غلام نے کہا حکیم قسطاس الحکمت انکا نام ہے۔"

یہہ ہے ہماری اس عجیب حکیم سے پہلی ملاقات جس طلسم کے عجائبات کا "بوستان خیال" میں بیان ہے اور جس کی سیر شاہزادہ معزالدین نے کی وہ طلسم اجرام واجسام سکندر ذوالقرنین کے حکم سے معلم اوّل حکیم ارسطوئے الٰہی نے ترتیب دیا تھا۔ اور اس کا داروغہ اپنے شاگرد رشید حکیم قسطاس الحکمت کو جو "علم وعمل و تجرد کی صفت میں یکتائے روزگار تھے" مقرر کیا تھا اور کہا تھا کہ "عہدۂ داروغگی اس طلسم کا تمھارے خاندان میں پانچ ہزار برس تک باقی رہے گا۔۔ اور جو داروغہ طلسم تمھاری اولاد سے ہوگا۔ ان سب کا نام ایک ہی ہوگا یعنی خطاب ان کا قسطاس ہی ہوگا۔" جن حکیم صاحب سے شاہزادہ معزالدین کو سابقہ پڑتا ہے وہ "آخری داروغہ طلسم ہیں اور وہ محض داروغہ طلسم نہیں" اپنے "علم و کمال میں بے مثال" ہیں اور انھوں نے اپنی طرف سے ہر طلسم ارسطوئے الٰہی میں "تصرفات کیے ہیں اور ان تصرفات کا نام "طلسم جدید رکھا ہے اور طلسم معلم اول کو طلسم قدیم مشہور کرتے ہیں"۔ غرض حکیم قسطاس الحکمت کی عدیم المثال شخصیت ہے۔ وہ عجیب وغریب دماغی اور روحانی طاقت رکھتے ہیں، جن۔ دیو، پری انکے تابع ہیں، شاہان طلسم ان کے حکم سے روگردانی نہیں کرسکتے۔ وہ بات کی بات میں اس کشتی

کو مغلوب کرتے ہیں۔ جو باتیں کہتے ہیں نہیں آتی ہیں ان سے وہ واقف ہوجاتے ہیں۔ کسی دل کا بھید ان سے پوشیدہ نہیں، ماضی حال و استقبال، نزدیک و دور، ہر قسم کی باتوں، ہر قسم کے واقعات سے انھیں پوری آگاہی ہے۔ وہ انسان کے جذبات کو بھی بدل دے سکتے ہیں۔ جب ملکہ نوبہار گلشن افروز اور ملکہ صبح دلکشا رقابت کی وجہ سے ایک دوسرے کی دشمن ہو جاتی ہیں اور شاہزادہ معز الدین کی جان ضیق میں پڑ جاتی ہے تو حکیم صاحب اس مشکل کو بھی آسان کرتے ہیں اور ملکۂ نوبہار گلشن افروز اور ملکہ صبح دلکشا کے دلوں سے رقابت کو دور کرتے ہیں۔ غرض حکیم صاحب کے اوصاف کا احاطہ ممکن نہیں ظاہر ہے کہ بزرجمہر ان سب اوصاف کے حامل نہیں۔ انھیں کسی طلسم سے کوئی واسطہ نہیں۔ ان میں وہ روحانی طاقت نہیں جو حکیم قسطاس الحکمت میں ہے۔ انکے اوصاف سب فطری ہیں۔ اس لئے ہم انکی شخصیت سے زیادہ متاثر ہوتے ہیں۔ لیکن حکیم قسطاس الحکمت سے ہم زیادہ مرعوب ہوتے ہیں وہ آخر آخر تک اپنا اثر شاہزادہ معز الدین پر قائم رکھتے ہیں۔ اور اس اثر کو شاہزادہ معز الدین کی بھلائی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ جب شاہزادہ معز الدین کی وفات کا زمانہ قریب آتا ہے اس وقت بھی وہ نصیحت کرتے ہیں "میری نصیحت پر عمل کرو۔ عشق مجازی کو چھوڑ کر عشق حقیقی اختیار کرو کہ کونین میں تم کو سرخروئی حاصل ہو" یہ گویا انکے آخری الفاظ تھے۔ پھر وہ آخری بار رخصت ہوئے "اور تھوڑی دور جا کر نظر صاحبقران اکبر سے پوشیدہ ہو گئے" اور قارئین کی نظروں سے بھی پوشیدہ ہو گئے۔

(۱۰)

"بوستان خیال" اور "داستان امیر حمزہ" کے عناصر ترکیبی میں کچھ زیادہ فرق نہیں۔ بعض اہم عناصر کا ذکر "طلسم ہوش ربا" کے ضمن میں ہو چکا ہے۔ اب میں چند ایسی باتوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو کہنے میں نہیں آئی ہیں۔ آسانی کے لئے مثالیں زیادہ تر "بوستان خیال" سے پیش ہوں گی۔ لیکن یہ باتیں "داستان امیر حمزہ" پر بھی منطبق ہوں گی۔

داستانیں ہماری دل چسپی کا ذریعہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ دل چسپی بہت بڑھ جائے گی، اگر ان میں ظرافت کا عنصر بھی موجود ہو۔ "داستان امیر حمزہ" اور "بوستان خیال" میں ظرافت کا جزو گویا جزو اعظم ہے۔ اردو ادب میں ظرافت کی کمی ہے۔ موجودہ زمانہ سے پہلے غالب کے خطوط اور سودا اور اکبر کی ہجویں، بس یہی سرمایہ ملتا ہے۔ تعجب ہے کہ ان داستانوں کی طرف کسی نے توجہ نہ کی، اور نہ ان سے کچھ سیکھا۔ یہاں ظرافت کیا ہے۔ ایک چوڑا اور عمیق دریا ہے

لیکن یہ دریا کچھ دیر سطح زمین پر بہتا ہے پھر کسی غار میں گر کر تحت الارض کے رستہ میں گم ہو جاتا ہے۔ استعارا برطرف۔ اگر یہ داستانیں محض خرافات سمجھ کر پس پشت نہ ڈالدی جاتیں۔ اگر ان کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جاتا ہے اور اردو انشا پرداز ان داستانوں کی خامیوں کے باوجود ان سے سبق لیتے تو شاید ظرافت کی اردو ادب میں ایسی کمی نہ ہوتی اور طالب علموں کا نداق و تمسخر، ان کی ہنسی دل لگی، ان کے چٹکلے اور فقرے آج سنجیدہ ظرافت کے نمونے نہ سمجھے جاتے۔ یہ ضرور ہے کہ ان داستانوں میں ظرافت اصل مدعا نہیں۔ یہ بھی درست ہے کہ یہاں ظرافت کے حدود زندگی کے حدود کی طرح وسیع نہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ یہاں ہجو کا وجود نہیں اور اگر ہے بھی تو اس کا ہونا نہ ہونے کے برابر ہے لیکن ان سب خامیوں کے باوجود یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ خالص ظرافت کا جو زور، جو ابھار ان داستانوں میں ہے وہ دوسری اردو تصنیفوں میں نہیں ملتا۔

کیسے زندہ دل تھے یہ اگلے مصنفین! موجودہ نوجوان انشا پرداز سمجھتے ہیں کہ پرانے مصنفین ضرورت سے زیادہ سنجیدہ واقع ہوئے تھے۔ ان کی صورت مقطع تھی اور انکی صورت سے زیادہ مقطع وہ علم، مذہب، اخلاق، تصوف اور اسی قسم کی خشک و بے لطف چیزوں میں پھنس کر اپنی رنگینی، شوخی زندہ دلی سے دستبردار ہو جاتے تھے۔ یہ تصور حقیقت پر مبنی نہیں۔ اسے واقعیت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں۔ جو رنگینی، شوخی زندہ دلی ان لوگوں کا حصہ تھی وہ آج ہمیں میسر نہیں۔ ہم ہنستے ہیں اور دوسروں کو ہنساتے بھی ہیں لیکن

اس ہنسی میں کچھ اندرونی کمی ہے :۔

ہونٹ ہلتے ہیں ہنسی میں لیکن
روح شاداب نہیں ہو پاتی

ہم ہنستے ہیں لیکن ہماری ہنسی سچی ہنسی نہیں۔ ہونٹ ہلتے ہیں۔ لیکن روح نہیں ہنستی۔ یہ خارجی ہنسی تشفی بخش نہیں ہوتی کیونکہ اس میں انبساط روح نہیں۔ روح کا پھیلاؤ، روح کا ابھار نہیں۔ اور یہ ممکن نہیں جب تک ہماری شخصیت میں کوئی مرکز ثقل نہ ہو۔ ایسا مرکز جو خارجی اثرات کو اپنی طرف کھینچ لے اور پھر یہاں سے ہماری ساری طاقتیں سورج کی کرنوں کی طرح چاروں طرف پھیل سکیں۔ ایسا مرکز موجودہ زمانہ میں نہیں ملتا۔ ہماری شخصیت گویا ایک پیاز ہے۔ چھلکے تہہ بہ تہہ جمع ہیں۔ چھلکوں کو ہٹایئے تو اندر کچھ بھی نہیں۔ اگلے لوگوں میں ایک مرکز ثقل موجود تھا۔ استعارہ بدل کر کہہ سکتے ہیں کہ ان کے پاؤں زمین پر مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے تھے۔ وہ نظام عالم میں اپنے مقام سے واقف تھے۔ ان کے خیالات تنگ و محدود لیکن روشن تھے وہ اپنے ماحول میں آسودہ تھے۔ ان کی روح مطمئن تھی دنیا و مافیہا سے انھیں کوئی شکایت نہ تھی۔ اس لیے وہ ہنستے تھے تو سچی خوشی سے۔ ان کی ہنسی میں گویا ان کی روح آرام کی انگڑائیاں لیتی تھی انکی ظرافت انکے اطمینان قلب کی آئینہ دار ہے اور پڑھنے والوں کے اطمینان قلب کا سبب۔

سچ تو یہ ہے کہ "داستان امیر حمزہ" یا بوستان خیال" ایک

عظیم الشان مذاق ہے، ایسا مذاق جس کا تصور بھی آج کل کے تنگ ذہنوں سے ممکن نہیں، ایسا مذاق جس کی تہہ میں سنجیدگی پنہاں ہے یا یوں کہیئے کہ جس کی وسعت، بلندی اور دلیری نقاب بن گئی ہیں جیسے سورج کی کرنیں اس کی نقاب ہیں۔ داستان کا عام تصور اور اس کی جزئیات دونوں میں ظرافت کی کارفرمائی ہے، جن دیو، پری، جادو، جادوگر، طلسمی اشیا، جس دنیا میں یہہ سب سانس لیتے ہیں پھر اس دنیا اور انسانی دنیا کا تصادم اور ان میں ربط ضبط، ہر جگہ اور ہر رنگ میں ہماری ہنسی کا سامان ہے۔ ہم ہنستے ہیں لیکن بہت جلد ہماری ہنسی متانت و سنجیدگی سے بدل جاتی ہے۔ ہمیں اس کا احساس ہوتا ہے کہ یہہ مضحکہ خیز چیزیں محض ہماری تفریح کا سامان نہیں یہہ چند علامتیں ہیں بہ ظاہر مضحک لیکن سنجیدہ معانی کی حامل یعنی یہاں سنجیدگی اور ظرافت شعلہ اور فلیتہ کی طرح ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں۔ جب کوئی مہیب دیو یا خوفناک جادوگر ہمارے سامنے آتا ہے تو ہمیں ہنسی آتی ہے لیکن اس کی طاقت کے خیال سے ہنسی رک جاتی ہے، دل دھڑکنے لگتا ہے اور ہم نہایت انہاک کے ساتھ صاحبقران اور اس دیو یا جادوگر کی نزاع کا انتظار دیکھتے ہیں۔ کہہ سکتے ہیں کہ داستان گو فوق العادت چیزوں پر یقین رکھتے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ جن دیو، پری انسان کی طرح خدا کی مخلوق ہیں۔ وہ جادو اور جادو کی طاقتوں کے قائل تھے۔ اس لیے یہ کہنا کہ ان چیزوں کی تخلیق میں انھوں نے ظرافت

سے کام لیا ہے۔ صحت سے دور ہے لیکن اگر غور سے دیکھا جائے تو ان چیزوں پر اعتقاد ظرافت کے عدم وجود کا ثبوت نہیں۔ حقیقت تو یہہ ہے کہ اگر داستان گو فوق العادت اشیاء کے تصور اور ان کی تخلیق میں ظرافت سے کام نہ لیتے، اگر وہ یہہ تصویریں کامل متانت و سنجیدگی کے ساتھ کھینچتے تو یہہ داستانیں ناکامیابی کی عظیم الشان اور عدیم المثال مثالیں ہوتیں۔ ہم ہنستے لیکن داستان گو کے ساتھ نہیں۔ ہاں تو ان داستانوں میں شعوری اور غیر شعوری طور پر ظرافت کا فیضان ہے۔ اس بلند و وسیع پیمانہ پر اس سلیقہ، اس دم خم کے ساتھ کہ مذاق باقی نہیں رہتا فلسفہ بن جاتا ہے۔

عیار تو گویا پیشہ ور ظریف ہے۔ ہنسنا ہنسانا اس کی زندگی کا مقصد ہے۔ وہ لوگوں کو ہنساتا ہے، لوگ اس پر ہنستے ہیں اور وہ دوسروں کو بیوقوف بنا کر ان پر خندہ زن ہوتا ہے۔ یعنی عیار بیوقوف نہیں ہوتا اور اپنی حماقت، اپنی ابلہانہ حرکتوں یا بولی چال سے قارئین کی ہنسی کا سبب نہیں ہوتا۔ ہوشمندی، ذہانت، ظرافت اور نکتہ سنجی اس میں بدرجۂ اتم موجود ہیں۔ شعوری طور پر اپنی دماغی تیزی اور تیز ظرافت سے صرف لے کر ایک دیوار قہقہہ کھڑی کر دیتا ہے۔ اس میں غور و فکر کا مادہ موجود ہے۔ سنجیدگی میں کوئی اس سے سبقت نہیں لے جا سکتا۔ ظاہری نادانی اور سبک سری کے بھیس میں کام کی باتیں کہہ جاتا ہے۔ یاوہ گوئی کی تہہ میں سنجیدگی پنہاں ہوتی ہے۔ جشن صاحبقران

یا بادشاہ کی وفاداری کا دم بھرتا ہے۔ اس کا ہمدم، مشیر و مددگار ہوتا ہے۔ جہاں کوئی سخت مرحلہ درپیش ہوتا ہے تو یہی عیار اسکی مشکل کو آسان کرتا ہے جب شاہزادہ عزالدین ملکہ شمسہ تاجدار کا ذکر سن کر اس پر عاشق ہو جاتا ہے تو ابوالحسن جو ہر تلاش میں نکلتا ہے اور کیسے کیسے مشکل مرحلوں سے گزر کر صحیح خبریں لاتا ہے، پھر شاہزادہ عزالدین کو مشورہ دیتا ہے اور برابر اس کو اپنے مشوروں سے فائدہ پہنچاتا ہے عیار مدبر ہوتا ہے ایک خواجہ عمرو کے سامنے بڑے بڑے مدبروں کی کوئی ہستی نہیں۔ یہہ ان کی شخصیت کا ایک اہم پہلو ہے۔ دوسرا پہلوان کی مسخرگی ہے۔ عیار بیک وقت مدبر ہے اور مسخرہ بھی اور خفیہ ایجنٹ بھی۔ سردست مجھے اس کی مسخرگی سے بحث ہے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ عیار کا پیشہ ظرافت ہے۔ اپنی دل کش باتوں سے کبھی وہ اپنے مالک کا دل بہلاتا ہے۔ اس کے پے لطف لمحوں کو دلچسپ بناتا ہے۔ قارئین کے لئے وہ گویا نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اگر عیار نہ ہوں تو پھر "داستان امیر حمزہ" اور "بوستان خیال" کا پڑھنا ناممکن نہیں تو دشوار تو ضرور ہو جائے۔ یہہ عیاروں کا فیض ہے کہ جب کبھی دلچسپی میں کمی ہونے لگتی ہے تو وہ اپنی عیاریوں سے اس کمی کو رفع کرتے ہیں یہہ صحیح ہے کہ ان کی عیاریوں میں یکسانیت ہے اور یہہ ایک طویل داستان میں ایک حد تک ناگزیر ہے۔ لیکن انھوں نے عجیب تیز ذہانت پائی ہے۔ اور عجیب و غریب طریقوں سے دشمنوں کو دھوکا دیتے ہیں۔

اور کبھی دوستوں پر بھی ہاتھ صاف کرتے ہیں۔ مثالوں کی ضرورت نہیں، ان کے تمسخر کی مثالوں سے ساری داستان بھری پڑی ہے دیکھنا یہ ہے کہ داستان کا یہ حصہ اردو میں سب سے پہلے اس بڑے پیمانہ پر ظرافت کا نمونہ پیش کرتا ہے۔ یہاں پہلی مرتبہ ظرافت ہر شکل وصورت میں نظر آتی ہے۔ پہلی مرتبہ اردو میں ظرافت کا دریا بہتا نظر آتا ہے اور یہ ظرافت کردار، واقعات گفتگو سبھی چیزوں میں موجود ہے ـــــ عیاروں کی شخصیت کے تصور میں ظرافت ہے۔ انکی بول چال میں ظرافت ہے، ان کی حرکتوں میں ظرافت ہے۔ اور یہ ظرافت محض عیاری کی دنیا تک محدود نہیں۔ مخالفین لشکر اسلام کی تصویر کشی میں بھی یہ عنصر نظر آتا ہے اور ظرافت کے ساتھ ساتھ طنز بھی موجود ہے۔ لیکن طنز اس اعلیٰ اور وسیع پیمانہ پر نہیں۔

یہی ظرافت ایک دوسری شکل میں بھی ظاہر ہوتی ہے اور وہ جنسی تعلقات کا بیان ہے۔ موجودہ افسانوں میں جنسی تعلقات کی عریاں تصویر کشی عام قانون ہے۔ پرانے خیال والے حضرات اس وجہ سے برہم ہوتے ہیں اور ان افسانوں اور افسانہ نگاروں کو برا بھلا کہتے ہیں۔ افسانہ نگار اور ان کے ہم خیال حضرات اس عریانی کی تعریف کرتے ہیں اور دونوں قسم کے لوگ اس عریانی کو نئی چیز سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ کوئی نئی چیز نہیں۔ تقریباً ہر زبان کے مشہور مصنفین میں اس قسم کی عریانی موجود ہے۔ دور کیوں جایئے "الف لیلہ"، "داستان امیر حمزہ"،

"بوستان خیال" میں یہ چیز پائی جاتی ہے۔ فرق صرف یہہ ہے کہ آج کل نفسیات اور نفسیاتی علامتوں سے مصرف لیا جاتا ہے۔ ورنہ جنسی تعلقات کا بیان کوئی نئی چیز نہیں کہ جس کا گلہ کیا جائے یا تعجب کے ساتھ خیر مقدم کیا جائے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اگلے مصنفین دماغی صحت سے بہرہ مند تھے۔ وہ روحانی اور جذباتی توازن رکھتے تھے اور ان نئی چیزوں کی صحیح قدر و قیمت، ان کے موزوں مقام و تناسب سے واقف تھے۔ اس لیے وہ جنسی تعلقات کے بیان میں مبالغہ، زیادتی، ناموزونیت اور اس قسم کے نقائص کے مرتکب نہیں ہوتے۔ وہ قصوں کے ذریعہ سے اپنے غیر صحت مند میلانات کا نکاس نہیں چاہتے۔ موجودہ زمانہ میں نوجوان مصنفین دماغی صحت سے بہرہ مند نہیں۔ وہ شاید دماغی صحت کی ضرورت اور اہمیت سے واقف نہیں۔ روحانی اور جذباتی توازن ان کے بس کی بات نہیں۔ ان کی دماغی اور جذباتی دنیا میں مختلف اور متضاد طاقتیں ہنگامہ آرا ہیں۔ وہ کشمکش سے واقف ہیں لیکن توازن اور سکون کی لذت سے آشنا نہیں۔ ان کا نقطۂ نظر محدود ہے اور اسکا لازمی نتیجہ زیادتی اور تشدد ہے۔ اگلے مصنفین میں یہہ زیادتی اور تشدد نہیں انھیں میلانات کے لئے کسی مصنوعی نکاس کی ضرورت نہیں۔ وہ جنسی تعلقات واقعات اور میلانات کا ذکر نہایت ہوشمند اور صحت مند طور پر کرتے ہیں۔ ظرافت اس پر مزید اصلاح کرتی ہے۔ اور ساری آلائشوں کو دور کر کے نہایت پاک شکل میں پیش کرتی ہے۔ وہ قہقہہ لگاتے ہیں اور قارئین کو

بھی قہقہہ لگانے پر مجبور کرتے ہیں۔ اور یہ قہقہہ سیل کی طرح سارے خس و خاشاک کو بہا لے جاتا ہے۔ مثلاً "بوستان خیال" جلد نہم کا وہ حصہ ملاحظہ ہو جہاں صاحبقران اکبر مہرہ مارے لے کر (جس کی وجہ سے وہ کسی کو نظر نہیں آتے) اور ابوالحسن جوہر ایک نازنین کی شکل میں بن کر محل کر سیر کرتے ہیں.....

اس واقعہ کے بیان میں کس درجہ عریانی سے کام لیا گیا ہے لیکن اس عریانی کی وجہ سے کسی جگہ بھی فحش کا شائبہ نہیں۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں مقصد صرف تفریح ہے۔ نہ کہ کسی ناموزوں میلان کو برانگیختہ کرنا۔ نتیجہ فحاشی نہیں بلکہ قہقہہ کی صورت میں روح کا پھیلاؤ ہے۔

ہنسنا ہسٹیریا کی وجہ سے بھی ہوتا ہے اور کسی دماغی فتور کی وجہ سے بھی۔ موجودہ زمانہ میں جس ہنسی سے ہم دوچار ہوتے ہیں اس کا سبب اکثر ہسٹیریا ہوتا ہے یا کچھ دماغی فتور۔ یہ اگلے مصنفین دماغی اور جسمانی صحت سے بہرہ ور ہیں۔ جس تہذیب کے وہ علمبردار تھے وہ تنگ و محدود تو ضرور تھی لیکن اپنے حدود کے اندر تشفی بخش تھی۔ اس لیے انکے دماغی اور جسمانی میلانات مجروح نہ ہوتے تھے۔ یہ تہذیب ایک مخصوص جلا رکھتی تھی اور اس جلا میں بڑی حد تک اس ادب کا بھی ہاتھ شامل تھا جس سے وہ واقف تھے۔ داستانوں میں اسی تہذیب کی جھلک صاف نظر آتی ہے موجودہ زمانہ میں تعلیم تو عام ہو گئی ہے لیکن جہالت اور کم علمی بڑھ گئی ہے۔ پہلے زمانہ میں تعلیم کا دائرہ مختصر اور تعلیم بھی مختصر قسم کی تھی لیکن اپنے طور پر پوری

اور ریختہ ہوتی تھی اور اس مختصر دائرہ کے باہر بھی ادبی ذوق پایا جاتا تھا
اس ادبی ذوق کا ایک ثبوت مشاعرہ ہے میں سمجھتا ہوں کہ مشاعرہ غزل
کی شہرت اور عام پسندی کا ایک اہم سبب ہے اور اسی وجہ سے اُردو
شاعری کی ترقی کا ایک بڑا دشمن۔ لیکن یہی مشاعرہ اس امر کا بھی
ثبوت ہے کہ اگلے زمانے میں غیر تعلیم یافتہ طبقہ میں ادبی ذوق
عام تھا۔ اسی ادبی ذوق کی عموصیت کا ثبوت داستانوں میں
بھی ملتا ہے "داستان امیر حمزہ" اور "بوستان خیال" میں
بے شمار اشعار ملتے ہیں اور یہ اشعار محض داستان گو کے ذوق
ادب کا ثبوت نہیں۔ ان سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ
سامعین بھی اس قسم کا ذوق رکھتے تھے اور وہ داستانوں
میں اشعار کی چاشنی ڈھونڈھتے تھے۔ آج برائے نام۔۔۔ بڑھے
لکھوں کی تعداد بہت زیادہ ہے لیکن زیادہ تر بی اے، ایم۔ اے کر لینے
کے بعد بھی کورے رہ جاتے ہیں۔ اُنھیں نہ تو ادب سے کوئی
دل چسپی ہوتی ہے اور نہ وہ ادبی محاسن کو سمجھنے کی صلاحیت
رکھتے ہیں، اگر ان کے سامنے کوئی شعر پڑھیے تو شاید وہ اس
کا مفہوم بھی نہ سمجھ سکیں گے۔ انھیں حسن الفاظ سے کوئی دلچسپی
نہیں ہوتی ہے جو زبان وہ استعمال کرتے ہیں وہ بے رنگ اور
پھیکی ہوتی ہے۔ رنگین اور چمکیلے الفاظ، ریشمی اور زریں فقرے
شان و تمکنت رکھنے والے جملے۔ یہ چیزیں ان کے بس کی بات

نہیں۔ وہ انگریزی تو سمجھ سکتے ہیں، وہ غلط ہی سہی لیکن عربی فارسی الفاظ کو غلط سمجھنے کی بھی استعداد نہیں رکھتے۔

بہرکیف داستانوں میں فارسی اور اردو اشعار کی کثرت ہے اور جب عبارت آرائی سے کام لیا جاتا ہے تو عربی اور فارسی الفاظ کی بہتات ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سامعین ان الفاظ کو سمجھ سکتے تھے یا کم۔۔۔ کم وہ ان کو پسند کرتے تھے اور ان میں دلچسپی لیتے تھے۔ سلطان اسمٰعیل زر و جواہر سر صاحبقران اکبر پر نثار کرتے ہوئے "سمت شہر عرشیہ روانہ ہوتے ہیں" راوی کہتا ہے کہ میں نے ایسے جلوس اور خدم حشم سے کسی بادشاہ روئے زمین کو عقد کرنے کو جاتے نہیں سنا تھا۔۔۔ جہاں تک نظر کام کرتی تھی سوائے جلوس کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔۔۔ صدا باجوں کی گنبد فلک تک جاتی تھی۔ ساکنان شہر یہ شور و غلغلہ عظیم سن کے متحیر ہو کر سوئے زمین دیکھتے تھے۔ پیر فلک حیران تھا۔ زمین کثرت مردم سے پامال ہوئی جاتی تھی۔ گاؤ زمین بار مردمان آبی سے دبی جاتی تھی۔ ماہی بے جبین ہو کر تڑپ رہی تھیں۔ زمین کو زلزلہ تھا۔ کثرت روشنی اس قدر تھی کہ سیاہی شب سفیدی سحر پر طعن کرتی تھی اور ضیائے صبح شرما کر مقابلہ نہ کرتی تھی۔ زمین کثرت چراغاں سے پر نور تھی۔ مثل سیاروں کے زمین پر چراغاں تھی ہر قندیل رشک مشعل ماہ تھی۔ غرض کہ زمین ضیا

ہیں رشک آسمان تھی۔ الغرض صاحبقران اکبر قصر نادرۂ رازدار سے بجلوس و تجمل مذکور المصدر بعد قطع مراحل و طے منازل حوالی شہر عرشیہ میں پہنچے۔ راوی صدق گفتار کہتا ہے کہ شہر عرشیہ کے ہر چہار جانب اس درجہ عمارات اور قصور عالی منزلت اور صحرائے پر بہار و مقامات فرحت افزا اور دلکشا تھے کہ وہ طبقۂ زمین رشک فردوس بریں معلوم ہوتا تھا اور ایک ایک قصر بے مثال کو دیکھ کر ہر ایک شخص متحیر ہوتا تھا۔ ایک جانب باغ مراد بخش واقع تھا۔ وہ باغ ایسا پر بہار تھا کہ گلشن ارم سے بھی تازگی اور شادابی میں کچھ بڑھا ہوا تھا ہزار بلبلیں اس باغ میں نغمہ سرائی کرتی تھیں اور ایک طرف نہر غریبہ واقع تھی۔ پانی اس کا ایسا لطیف و شیریں تھا کہ آب حیات سے آبرو میں رتبہ برتری رکھتا تھا اور ایک سمت مرغزار ایسا واقع تھا کہ روح کو اس کی سیر سے تازگی حاصل ہوتی تھی اور دل کو فرحت ہوتی تھی۔ علاوہ اس کے صدہا چمن ہائے رنگیں گرد و پیش شہر کے واقع تھے اور ہزارہا عمارت عالی شان نظر آتی تھیں۔"

ظاہر ہے کہ یہاں عربی فارسی الفاظ کی تعداد بہت زیادہ ہے سامعین ان الفاظ کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتے تھے اور وہ داستانگو سے ایسے موقعوں پر رنگینی و رعنائی زبان کی توقع رکھتے تھے اور یہ بھی ظاہر ہے کہ اس عبارت میں کوئی خاص تصنع نہیں۔

وقت کا لحاظ رکھتے ہوئے کہہ سکتے ہیں کہ یہ عبارت غیر فطری نہیں فطری ہے الفاظ کی کثرت کے ساتھ ساتھ اردو اور فارسی مصرعوں، اشعار غزلوں کی بھی کثرت ہے۔ مثالوں کی ضرورت نہیں "بوستان خیال" یا "داستان امیر حمزہ" کو اٹھا دیکھئے مثالیں بکھری پڑی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو فارسی کے اشعار، مصرعے اور جملے زبان پر منجھے ہوئے تھے: بہر زمین کہ رسیدیم آسماں پیدا است، نقاش نقش ثانی بہتر کشد ز اول، مشکلے نیست کہ آساں نہ شود، مرد باید کہ ہراساں نہ شود، رموز مملکت خویش خسرواں دانند، دشمن چہ کند چو مہرباں باشد دوست، خاکساران جہاں را بہ حقارت منگر، تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد، تا نہ باشد چیزکے، مردم نگویند چیزہا، حریفاں بادہا خوردند و رفتند۔ تہی خمخانہ کردند و رفتند، آفریں باد بریں ہمت مردانۂ تو، وعدۂ وصل چوں شود نزدیک۔ آتش شوق تیز تر گردد، مروت بہ کہ مردم آزادی، آں را کہ عیاں ست چہ حاجت بہ بیاں، بدوزد طمع دیدۂ ہوشمند، تا جہان ست در جہاں باشی۔ برہمہ خلق کامراں باشی، نیش عقرب نہ از پے کین ست۔ مقتضائے طبیعتش این ست، اے آمدنت باعث آبادی ما۔ طاقت مہمان نہ داشت خانہ بہ مہماں گذاشت، چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ ہر عیب کہ سلطان بہ پسندد ہنر است، چراغ کا بئے

کند عاقل کہ باز آید پشیمانی، آسائش دو گیتی تفسیر این دو حرف ست، با دوستان تلطف با دشمنان مدارا، ہر رسیدہ بود بلائے ولے بہ خیر گزشت۔۔۔۔۔۔ ہر قسم کی بات، ہر موقع کے لیے فارسی یا اُردو اشعار زبان زد تھے۔ کسی جگہ کوئی کمی نہیں محسوس ہوتی، یہ اشعار بھی ہر رنگ اور ہر مرتبہ کے ہیں، اچھے بھی اور بُرے بھی، حسب حال بھی اور اکثر محض "ٹھونس ٹھانس" کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کہ اردو اور فارسی شعرا سے کافی واقفیت تھی اور مذاق کافی وسیع تھا۔ میر، مومن، ذوق، آتش، ناسخ، نسیم، قلق، جلال، داغ، جواد، سودا، سطوت، یاس، رعنا، ظفر، رند، غرض ہر رنگ و ہر پایہ کے شعرا اس جمگھٹ میں نظر آتے ہیں۔ اچھے بُرے شعرا، اچھے بُرے اشعار کی تمیز نہیں نہیں۔ خصوصاً جب داستان گو اپنے ذوق ادب سے سامعین کو متاثر کرنا چاہتے ہیں تو اکثر عجیب و غریب قسم کے نتائج ظہور میں آتے ہیں۔ بے موقع و بے محل، وہ نامناسب و غیر متعلق اشعار کی بھرمار اکثر روا رکھتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر اثر خوشگوار ہوتا ہے۔

داستان کیا ہے گویا ایک کشادہ سبز پوش وادی ہے جس میں جا بجا خوش نما پھول قدرت نے لگائے ہیں، جو ہمیں دعوت نظارہ دیتے ہیں۔ کہیں کوئی حسین چشمہ میٹھی آواز میں گنگنا رہا ہے اور کسی جگہ درختوں کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے ہمارے لیے جھکی ہوئی ہیں

کبھی کبھی ناخوشگوار مناظر سے بھی سابقہ پڑتا ہے۔

ادبی چاشنی کے علاوہ ان داستانوں میں ایک اور بھی ادبی دلچسپی کا سبب ہے جس کی جانب سے عموماً لاعلمی ظاہر ہوتی ہے ان داستانوں میں پہلی مرتبہ نثر کا اس وسیع پیمانہ پر استعمال ہوا اور ایسے زمانہ میں جب نثر نے موجودہ شکل اختیار نہ کی تھی۔ اس لئے اگر ان داستانوں میں کسی قسم کے محاسن نہ ہوتے تو بھی یہہ تاریخ نثر اُردو میں ایک خاص اہمیت رکھتیں اور ان کا ایک بزرگ مقام ہوتا۔ غالباً ہر زبان میں شعر و نثر سے پہلے عالم وجود میں آیا اور ہر ادب میں شعر کی، پہلے اور جلد ترقی ہوئی۔ اُردو میں بھی یہی واقعہ ہوا۔ نثر کی ترقی دیر میں ہوتی ہے۔ پہلے اس میں حسن صوت کی کمی ہوتی ہے اور ادبی نثر مصنوعی قسم کی ہوتی ہے۔ "داستان امیر حمزہ" اور "بوستان خیال" اس قدر طویل ہیں کہ ان میں کسی مصنوعی قسم کی انشاء کا نباہ ممکن نہ تھا۔ یہہ ضرور ہے کہ کبھی کبھی ان میں بھی انشا مصنوعی ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جب داستان گو عبارت آرائی پر آتے ہیں تو پھر وہ افیون کی ترنگ میں آسمان زمین کے قلابے ملاتے ہیں لیکن یہ عبارت آرائی ہر جگہ ممکن نہ تھی اس لیے عموماً نسبتاً ہلکی پھلکی نثر کا استعمال ہوتا ہے۔ ایسی نثر جس سے کم سے کم متلی تو نہیں آنے لگتی۔ عام رنگ یہہ ہے:۔

"جب میں بار دگر گنبد مذکور میں کہ ایک غار میں نہاں تھا پہنچی اس وقت وہ دیو اُس جگہ نہ تھا۔ میں نے اس کا انتظار کیا۔ جب وہ

شکار گاہ سے آیا مجھ کو دیکھ کر کہا کہ اے گیسو بریدہ بار دگر تو کیوں آئی
میں نے کہا کہ اے شاہ جنیاں مجھ پر عجب کیفیت گذری یعنی ایک
روز میں میری مادر و پدر نے قضا کی اور میں بیکس محض ہوگئی اور
اس روز سے کہ تو مجھ کو لے گیا اور مجھ پر مہربانی کر کے رہا کیا
اس روز سے تیری محبت میرے دل میں پیدا ہوگئی تھی۔ اسی
وجہ سے میں تیرے پاس آئی۔ دیو یہ حال یہ سن کر مجھ پر مہربان ہوا
اور کہا کیا مضائقہ القصہ میں نے وہاں بود و باش اختیار کی اور منتظر
فرصت تھی لیکن جب دیو شراب سے مست ہوتا تھا مجھ سے کہتا تھا کہ
کچھ گاؤ، جو کچھ مناسب وقت ہوتا تھا میں اس کے سامنے گاتی تھی اور
وہ روتا تھا۔ میں نے اس سے سبب گریہ پوچھا اس نے کہا تو نہیں
جانتی میں عاشق ہوں میں نے پوچھا کس پر عاشق ہے۔ اس نے
کہا میں اس کا نام و نشان نہیں جانتا۔ ایک سنگ اس گنبد کی
دیوار پر نصب ہے اور ایک تصویر اس پر کھینچی ہے میں اس
تصویر پر عاشق ہوں مگر یہ نہیں جانتا کہ وہ کون ہے اور کہاں
ہے۔ میں نے کہا تو اس کو تلاش کیوں نہیں کرتا۔ اس نے کہا میں
نگہبان شمشیر ہوں کیوں کر اس کی تلاش کو جاؤں۔ لیکن اس قدر جانتا
ہوں کہ آخر وہ معشوقہ میرے ہاتھ آئے گی۔ بعد ازاں میں نے کہا
مجھ کو گنبد کے اندر لے چل تاکہ تیری محبوبہ کی تصویر دیکھوں۔ اس
نے کہا یہ حکم نہیں کہ دوسرا گنبد میں جا سکے۔ مجھ سے میں نے

نہایت سلوک کیا کہ اس مقام پر مجھ کو رہنے کی اجازت دی۔۔۔ ایک روز وہ شکار کو گیا تھا۔ میں نے ایک سنگ اٹھا کے قفل گنبد کے توڑنے کا قصد کیا لیکن ہر چند سعی کی وہ قفل نہ ٹوٹا۔ میری عقل ناقص میں یہ آیا کہ اگر شمشیر مجھ کو مل جائے تو دیو کے یہاں سے بھاگ جاؤں۔ تا شام میں نے سعی کی لیکن وہ قفل نہ کھلا۔ اس اثنا میں وہ دیو بھی آیا اور میری خیانت پر مطلع ہو کے برہم ہوا اور میری ہلاکت کا قصد کیا مگر کہا کہ چونکہ روز اول میں تجھ پر مہربان ہوا اور تجھ کو قتل نہ کیا۔ اب بھی قتل نہ کروں گا لیکن ایسی قید میں رکھوں گا کہ جو قتل سے بدتر ہو۔ یہ کہہ کے مجھ کو ایک غار میں قید کر کے ایک سنگ اس پر رکھ دیا۔ شبانہ روز میں ایک بار نکال کے مجھ کو میوہ و آب دیتا تھا اور کہتا تھا، ایک تو تیرا گانا مجھ کو نہایت پسند ہے اور دوسرے میری محبوبہ کی ہم صورت ہے اگر یہ دو وجہ مانع نہ ہوتیں تو میں اب تک تجھ کو قتل کر دیتا۔

اس عبارت میں تصنع اور تکلف نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ اُسے کوئی موجودہ نثر اردو کا نمونہ نہیں سمجھ سکتا۔ اب لب و لہجہ، جملوں کی ساخت اور ترکیب۔ اکثر الفاظ کے استعمال کا طریقہ، یہ سب چیزیں کسی گذرے ہوئے زمانہ کا پتہ دیتی ہیں، لیکن اس گذرے ہوئے زمانہ کی آواز اور موجودہ آواز میں بہت زیادہ فرق نہیں، ممکن ہے کہ دوسرے مقامات پر فارسی عربی الفاظ اور ترکیبیں زیادہ

نظر آئیں لیکن "داستان امیر حمزہ" یا بوستان خیال" کی انشاء مجموعی حیثیت سے مصنوعی نہیں کہی جاسکتی۔ اس کے علاوہ داستانوں میں موضوعات مختلف قسم کے ہیں۔ ہر وقت نت نئے واقعات پیش آتے ہیں کہیں معشوق کا سراپا ہے تو کہیں عاشق کی جانکنی، کبھی جنگ کا نقشہ ہے تو کبھی عیش و عشرت کا سماں، جن، دیو، پری، جادوگر، مسلمان، کافر غرض ہر طرح کے لوگ بستے ہیں اور اپنی زندگی کے دن گزارتے ہیں اور ان کی زندگی میں عجیب و غریب واقعات پیش آتے ہیں۔ ان سب چیزوں کا بیان نثر میں ہے اور مختلف قسم کی نثر میں۔ یعنی یہاں نثر سے مختلف قسم کے مصرف لیے گئے ہیں اور نثر کو اس قابل بنایا گیا ہے کہ اس سے مختلف قسم کے مصرف لئے جاسکیں۔ جس نثر کا یہاں استعمال ہوا ہے اس کی بنیادی زبان ہے جو عام گفتگو میں مستعمل ہوتی تھی اسی وجہ سے یہ قابل قدر ہے ممکن ہے کہ بعض اصحاب کو ضرورت سے زیادہ عربی و فارسی الفاظ نظر آئیں گے لیکن ایسا ہونا تو ناگزیر تھا کیونکہ اس زمانہ میں عربی فارسی الفاظ نظر آئیں لیکن ایسا ہونا ناگزیر تھا کیونکہ اس ــــ زمانہ میں عربی اور خصوصاً فارسی سے واقفیت عام تھی اور ان پڑھ بھی فارسی الفاظ کا استعمال بے تکلف کرتے تھے اگر غور سے دیکھا جائے تو ان داستانوں میں اسی زبان

کا استعمال ہوا ہے جسے ہم موجودہ اردو نثر کہتے ہیں۔ اب یہ
یہ زیادہ ہلکی پھلکی زیادہ چمکیلی، زیادہ لچکیلی، زیادہ بوقلمونی کی
حامل ہو گئی ہے اور بس۔